طاہرہ غفور
پی ایچ-ڈی، سکالر (اُردو)
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

بانو قدسیہ کے افسانے " کلو" کا مابعدنوآبادیاتی تناظر میں تجزیہ

This paper begins with a brief introduction of Post Colonial trend in literature that starts with the resistance against colonial system. I developed in the occupied countries in one way or other. This reversal could be felt on not only socio-political but also on literary level. The great literary person brings forth the effects of colonial system in their writings. This article is an analysis of Bano Qudsia's short story "Kallo" in the perspective of post colonial effects. In this regard, the frame work of Home. K. Bhaba's theory should be applied. This article explains the nice application of Bhaba's theory in the scenario of the short story "Kallo". At last we can understand more the effects of Colonial system and how these attitudes are prevailing up till now in our society.

کسی غیر ملکی طاقت کا اپنی سرحدی حدود سے باہر دوسری اقوام کے اقتدارِ اعلیٰ کو ختم کرنا اور مقامی لوگوں کے حقوق و وسائل کا استحصال کر کے اپنے آبائی وطن کو معاشی طور پر مضبوط کرنا نوآبادیات کہلاتا ہے۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت نہ صرف اندرونی طور پر کمزور ہوگئی بلکہ بیرونی سازشوں سے بھی اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ غیر ملکی طاقتیں آہستہ آہستہ سیاسی استحکام حاصل کر رہی تھیں۔ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانیوں کا ہمدرد بن کر پرتگالیوں کے ظلم وستم سے تو نجات دلا دی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہاں اپنا تسلط قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ سیاسی و معاشی بدحالی نے مقامی لوگوں کے کردار کو بھی تباہ کر دیا۔ جس کے بارے میں اس دور کے ادب میں تصویر کشی کی گئی۔ ایسی حالات میں نوآبادیاتی نظام بہتر محسوس ہوتا تھا۔

سترھویں صدی سے بیسویں صدی کے وسط تک انگریزوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ اٹھارہویں صدی میں انگریز مضبوط حکمت عملی سے اپنا تسلط قائم کر چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد برصغیر کی مکمل حکومت انگریزوں نے حاصل کر لی اور مسلمانوں کو تعلیمی، سیاسی، مذہبی اور ثقافتی نیز ہر لحاظ سے پسماندہ کرنے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ فرنگیوں کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا لیکن قائدِ اعظم کی سربراہی اور علامہ اقبال کی فکر انگیز شاعری کے ذریعے باعمل مسلمانوں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا وجود ممکن بنایا اور انگریز یہاں سے رخصت

ہوئے۔نوآبادیاتی اثرات اتنے ہمہ گیر تھے کہ سماج میں اس کے پنجے ابھی تک گڑھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔اگرچہ ہندوستانی معاشرے کی اپنی الگ تہذیب و روایات تھیں۔انگریزوں کی آمد کے بعد نہ صرف افواج کی جنگ ہوئی بلکہ مشرق ومغرب کی تہذیبیں بھی آپس میں ٹکرائیں۔نوآبادیاتی عہد کی ان تبدیلیوں کا اثر ادب پر بھی ہوا۔اس دور میں لکھا جانے والا ادب ہندوستانیوں کے سیاسی وسماجی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ادب معاشرے کی نمائندگی کرتا ہے اوراس دور کے ادیبوں نے بھی معاشرتی احساسات کومعنویت کا لباس پہنایا۔انھوں نے ہرطرح کے استحصال کے خلا ف آواز اٹھائی۔ادب میں سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، اکبرالہٰ آبادی، شبلی نعمانی، حالی، کرشن چندر، پریم چنداور سعادت حسن منٹو کی تحریریں نوآبادیاتی اثرات کی عکاسی کرتی ہیں۔سجادظہیر کے ناول "لندن کی ایک رات" کے پس منظر میں معاشرتی رویے واضح نظر آتے ہیں۔ پروفیسر احمد علی نے "مہاوٹوں کی ایک رات" میں جنس اورغربت پر لکھا۔ان کے افسانے "قید خانہ"، "غلامی"، "قلعہ" اور "تصویر کے دورخ" میں برطانوی سامراجی اثرات ملتے ہیں۔کرشن چندر کا ناول "شکست" بغاوت اورخودغرضی کے احساسات لیےنوآبادیاتی عہد کا ایک اہم ناول ہے۔ عصمت چغتائی نے "ٹیڑھی لکیر" میں انگریزوں کے احساس برتری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھنوں کو بیان کیا۔عظیم بیگ چغتائی نے''کالے گورے'' میں ابراہیم جلیس نے "چالیس کڑور بھکاری" میں اورمحمد حسن عسکری نے اپنے افسانوں میں انگریزوں کی دی ہوئی الجھنوں کی تصویرکشی کی ہے۔عزیز احمد کا ناول "آگ" اور " گریز" سعادت حسن منٹوکا افسانہ "نیا قانون"، ہاجرہ مسرور کے افسانے "سرگوشیاں" اوراحمد ندیم قاسمی کے افسانے نوآبادیاتی اثرات کو پیش کرتے ہیں۔اس نظام کے اختتام کے باوجود بہت سارے ادیب اس حوالے سے لکھتے رہے۔اختر حسین رائے پوری کی افسانویت،قرالعین حیدر کی مغربی مثالیت پسندی اورشوکت تھانوی کا سماجی طنز ان کے افسانوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں مغربی تہذیب کی تقلید آج بھی نمایاں ہے۔مقامی باشندوں کی اکثریت اپنی تہذیب کوکمتر جانتے ہوئے مغربی تہذیب کی پیروی کر رہی ہے۔لباس، زبان، ثقافت اور رویوں میں انگریزوں کی نقل کی جاتی ہے اور ان سب اثرات کا ذکرہمیں مابعدنوآبادیاتی تحریروں میں ملتا ہے۔مابعدنوآبادیاتی ادب سے مراد وہ ادب ہے جوآزادی کے بعدتخلیق ہوا۔اس میں ہمیں نوآبادکاروں کے جانے کے بعد مقامی رویوں میں سامراجی اثرات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ان تحریروں سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ نوآبادکاروں کے جانے کے باوجودان کی چھاپ مقامی باشندوں کے ذہنوں پرموجود ہے۔ادیبوں نے اس کشمکش کواپنی تحریروں کے ذریعے عیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

زیرِنظرمضمون میں بانو قدسیہ کے افسانے " کلو" کا مابعدنوآبادیاتی تناظر میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ بانو قدسیہ اردو ادب کی ایک نامورادیبہ ہیں۔وہ نہ صرف اردوادب کا قیمتی سرمایہ ہیں بلکہ اپنے عہد کی ترجمان ادیبہ ہیں۔انھوں نے

اپنی تحریروں میں لوگوں کے داخلی رویوں، نفسیاتی کیفیات، انسانی شخصیت میں ہونے والی شکست و ریخت، نا آسودہ خواہشات اور مغرب کی بے جا تقلید کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ نسلی، قومی اور مسلکی امتیازات کو انسانیت کے منافی تصور کرتی تھیں۔ بانو قدسیہ کا افسانہ " کلو"[۱] اسی معاشری ناہمواری کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس افسانے کا مابعد نوآبادیاتی تناظر میں تجزیہ کرنے کے لیے مابعد نوآبادیاتی مطالعات کو متعارف کروانے والے سکالر ہومی۔ کے۔ بھابھا۔(Home.K.Bhaba) کے پیش کردہ ماڈل کے اصولوں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ بھابھا (۱۹۰۹ء۔۱۹۶۶ء) نے The location of culture [۲] میں اس نظریے کو پیش کیا۔ اس کتاب میں مابعد نوآبادیاتی حوالے سے درج ذیل نکات پیش کیے گئے۔

۱۔ نوآبادیاتی باشندوں کا دوغلا پن (Hybridity Culture)

۲۔ متضاد جذبات (Ambivalence / Duality)

۳۔ ثقافتوں کا فرق، اعلانیہ اور دقیانوسی تصورات

(Cultural difference enunciation and stereotype)

۴۔ نقالی (Mimicry)

۵۔ مقام ادغام (SpaceThird)

افسانے " کلو" کا تجزیہ ان ہی نکات کے پیشِ نظر کیا جائے گا۔ اس افسانے میں دو کرداروں کلثوم اور ساجد کو علامتی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ کلثوم کا کردار اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے باعثِ توجہ ہے لیکن وہ کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار نہیں ہے۔ ساجد جو اس کا خالہ زاد ہے، اپنی گوری رنگت کی وجہ سے کلثوم کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، لیکن کلثوم ہمیشہ خود اعتمادی سے اس کے طنز کا جواب دیتی ہے، جس سے وہ لاجواب ہو کر رہ جاتا ہے۔ ساجد جس کو کلثوم پیار سے سجّو پکارتی ہے۔ اسے اپنے گورے رنگ پر بہت ناز ہے اور کلثوم جسے ساجد حقارت سے کالے رنگ کی وجہ سے کلو کہتا ہے، بہت پُر اعتماد ہے۔ سجو کلثوم کو سیاہ رنگ کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے اور آخر میں اسی معمولی شکل وصورت کی لڑکی سے شکست کھا جاتا ہے۔ انا کی جنگ میں وہ اپنی محبت کا اظہار تو نہیں کرتا لیکن اس کی زندگی اندھیروں کی نظر ہو جاتی ہے جبکہ کلو ایک خوشگوار ازدواجی زندگی گزارتی ہے۔

اس مضمون میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نوآبادیات کے اثرات ادب میں کرداروں کے طرز فکر و عمل سے کیسے پیش کیے گئے ہیں۔ کرداروں کے امتیازی رویے نوآبادیات کے پس منظر کو پیش کرتے ہیں۔ یوں آزادی حاصل

کرنے کے باوجود ہم ذہنی غلامی سے نجات پانے میں اب تک ناکام ہیں۔

بھابھا کے نظریے کے پہلے نکتے کے مطابق مابعد نوآبادیات میں مقامی باشندے دوغلے پن کا شکار ہو جاتے ہیں یعنی جب حاکم اور محکوم کی ثقافتیں آپس میں مدغم ہو جاتی ہیں تو مقامی باشندے خود کو ایک نئی ثقافت میں ڈھال لیتے ہیں جس میں حاکم کی ثقافت غالب نظر آتی ہے۔[۳] افسانے کا اس حوالے سے جائزہ لیا جائے تو کچھ مواقع پر کرداروں کے رویوں سے دوغلا پن جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ سجو اپنی ماں سے استفسار کرتا ہے کہ اماں کلثوم اتنی کالی کیوں ہے؟ باقی بہن بھائی تو گورے ہیں پھر کلو کیوں الگ تھلگ محسوس ہوتی ہے کہ اپنی نہیں لگتی۔ اس پر اماں جی جواب دیتی ہیں:

"اپنی ہی تو ہے۔۔۔تمھاری خالہ ممتاز کی لڑکی جو ہوئی۔۔۔شاید اماں بھی اسے اپنی کوکھ سے جنی سمجھتے ہوئے شرماتی تھیں۔"[۴]

سیاہ رنگ کو ہمارے معاشرے میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور چونکہ برصغیر کے لوگ بہت عرصے تک انگریزوں کے غلام رہے اور انگریزوں نے بھی کالے رنگ کو ہمیشہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا، اسی بنا پر آزادی کے بعد بھی ہمارے لاشعور سے غلامی کے اثرات ختم نہیں ہو سکے کیونکہ ہم آج بھی گورے کالے کے امتیازات میں مقید ہیں۔ اس افسانے میں بھی کلو کی خالہ اس سے اپنائیت رکھنے کے باوجود اسے اپنا کہتے ہوئے شرماتی ہے اور دوغلے پن سے کام لیتے ہوئے اس کی حقیقت واضح کر دیتی ہے۔

سجو اپنے دوستوں کے جھوٹے سچے معاشقوں کے قصے سن سن کر دل ہی دل میں کم مائیگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے دوست اسے تنہائی کے طعنے دیتے ہیں اور ان طعنوں کے بوجھ سے بچنے کے لیے وہ کلو کا سہارا ہی تلاش کرتا ہے کیونکہ وہ یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ کلو کافی ذہین ہے اور اب جبکہ سجو کو کلو سے کام پڑ جاتا ہے تو اس کا بلانے کا انداز ہی بدل جاتا ہے وہ اسے اس کے پورے نام سے پکارتا ہے۔ "کلثوم میں نے خوشامدی لہجے میں اس کا پورا نام لیا۔"[۵] یہاں سجو کا دوغلا پن صاف ظاہر ہے۔ ظاہری طور پر تو وہ کلو کا مذاق اڑاتا رہتا ہے۔ اسے کالے رنگ کی وجہ سے کمتر ثابت کرنے پر تلا رہتا ہے۔ لیکن دل میں اس بات کا معترف ہے کہ کلو اس سے ذہنی لحاظ سے بہتر ہے اور اس موقع پر اس کا نام بھی کلو کے بجائے کلثوم پکارتا ہے اور اس سے مشورہ لینے کے بعد اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ یہاں نہ صرف سجو کا دوغلا پن جھلک رہا ہے بلکہ اس کے دوستوں کے جھوٹے رومانوی قصے بھی دوغلے پن کا واضح ثبوت ہیں۔ سجو ان کے بارے میں یوں افشائے راز کرتا ہے:

"میرے نئے نئے بالغ دوست اپنے تخیلی رومان یوں سناتے تھے گویا وہ واقعی ان کی زندگی سے ہو کر

گزرے ہوں۔۔۔کوئی آہ بھر کر کہتا کہ یہ سنہری بالوں کی لٹ دیکھتے ہو اس کی عنایت ہے۔۔۔کوئی اپنے لکھے ہوئے خطوط اس رعب سے دکھاتا۔۔۔۔۔"۶

اس کے دوست اپنی خیالی محبوبہ بھی کوئی گوری چٹی اور سنہرے بالوں والی ہی تصور کرتے اور اپنے خیالی رومان پرور قصوں سے دوسروں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے۔ سجو بھی اسی روش پر چلتے ہوئے کلو کے ساتھ مل کر کوئی افسانہ گھڑ لیتا اور پھر دوستوں میں ڈینگیں مارنے کے قابل ہو جاتا۔ سجو اس دوغلے پن میں اتنا آگے چلا جاتا کہ خیالوں ہی خیالوں میں جیون ساتھی کے روپ میں بھی اسے ایک گوری لڑکی ہی نظر آتی اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اچانک اس کے سپنوں کی رانی اس کے سامنے آجاتی ہے۔

"میں ستون کے ساتھ پیر جمائے آرام کرسی میں دھنسا ایک گوری سی لڑکی کے خواب دیکھ رہا تھا جب وہ خود ہی خواب کی تعبیر بن کر آ گئی۔"۷

سجو دل ہی دل میں کلّو کو پسند کرتا تھا لیکن ذہنی طور پر ایک کالی لڑکی کو جیون ساتھی کے روپ میں قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ یہی وجہ ہے سماجی معیار کو اپناتے ہوئے ایک گوری لڑکی سے محبت کرنے پر اپنے دل کو مجبور کرتا رہتا اور آمنہ کے روپ میں وہ لڑکی اس کے سامنے آجاتی ہے۔ تاہم بعد میں وہ آمنہ میں کوئی خاص دلچسپی محسوس نہیں کرتا۔ بس اپنے دل کو جھوٹے دلاسے دے کر سلا دیتا۔

بھابھا نے اپنی تھیوری میں ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا کہ مقامی باشندے متضاد جذبات میں گھرے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بیرونی اثرات یا کسی عمل کے خلاف متضاد جذبات کا اظہار کرتے ہیں یعنی تابع بھی ہوتے ہیں اور باغی بھی۔ وہ بیک وقت کسی خاص فرد کے لیے محبت اور نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ دوگرفتگی کا شکار رہتے ہیں۔ ۱۸افسانے میں کلو سجو کے مسئلے کا حل نکالتے ہوئے اسے ایک سکیم بتاتی ہے جس پر عمل کر کے سجو اپنے دوستوں میں خیالی محبوبہ کے قصے بیان کر سکتا تھا۔ اس منصوبے کے تحت اسے کلو کو اپنی مرضی کی محبوبہ بنانا پڑتا اور کلو اسے محبت نامے لکھتی لیکن اس سکیم کے بارے میں سن کر سجو حیران و پریشان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

"میرے تصور کی ملکہ کلو جیسی نہ ہو سکتی تھی میری تخیلی دنیا کو دھچکا سا لگتا تھا کہ اس میں کلو جیسی شہزادی ہو۔"۹

اس بیانیے کے بعد ہم سجو کے متضاد جذبات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ سجو کے کردار کی پہلی واضح تصویر جب بنتی ہے جب وہ کلو سے لڑائی کرتا ہے اور اس گتھم گتھا میں سیاہی کی دوات پلٹ کر کلثوم کے کپڑوں اور چہرے پر گر جاتی ہے اور سجو اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتا ہے کہ "سیاہی گر بھی گئی تو کون سی آفت آ گئی۔"۱۰ کیونکہ اس کے خیال میں

سیاہی جیسا ہی تو کلو کا چہرہ تھا۔ اس موقع کی مناسبت سے سجو کا رویہ اس کی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جس سے یہی تاثر ابھرتا ہے کہ سجو بچپن سے ہی کلو کی سیاہ رنگت سے نفرت کرتا ہے۔ لیکن بڑے ہونے بعد اس کا دل اس کے ذہن کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا ہے اور وہ متضاد جذبات میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ اپنی انا کی تسکین کے لیے وہ یہ بات قبول کرنے سے انکاری ہے باوجود اس کے کہ وہ کلو کی عقل مندی اور معاملہ فہمی کا دل سے قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسئلے کی صورت میں کلو کے مشورے پر ہی عمل کرتا ہے اور جب کبھی اس کے دل کی کیفیت اس پر عیاں ہوتی ہے تو وہ دل کو بھی ڈپٹ کر چپ کروا دیتا ہے۔ سجو اپنی حالت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

" کچھ دنوں مجھ پر عجیب قسم کی خفت طاری رہی۔ میں اسے جھاڑو پھیرتے دیکھتا تو رک جاتا۔ اس کے جھکے ہوئے کندھے اور لمبی لمبی بانہیں کچھ اس طرح اس دن والا واقعہ پھر رونما ہو جائے۔" ۱۱

لیکن سجو کی ہٹ دھرمی ملاحظہ ہو کر کلو کا قرب چاہنے کے باوجود وہ اسے رنگت کی وجہ سے اپنانے سے انکاری ہے۔ وہ اپنے دل کے جذبات سمجھنے سے قاصر ہے اور متضاد کیفیات میں گھرا رہتا ہے۔ اس کے جذبات گورے کالے رویوں میں دب کر رہ جاتے ہیں اور اس کا حل وہ یہ ڈھونڈتا ہے کہ کلو کا سامنا کرنے سے کترانے لگتا ہے۔ سجو کہتا ہے:

"وہ میرے سامنے آتی اور میں مڑ جاتا۔ وہ کچھ پوچھنے آتی اور میں بے انتہا مصروفیت ظاہر کرتا۔ وہ دودھ کا گلاس لیے کھڑی ہے میں خواہ مخواہ آنکھیں موندے پڑا ہوں۔" ۱۲

اس کا خیال تھا کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے وہ اس کش مکش کی صورتحال سے نجات حاصل کر لے گا لیکن درحقیقت ایسا نہ ہو سکا۔ اگرچہ ساجد کلو کا مذاق اڑاتا رہتا لیکن کلو اس کے جذبات سے واقف تھی۔ اسی لیے جب کبھی سجو اس کے سامنے کوئی جذباتی حرکت کر بیٹھتا تو دزدیدہ نظروں سے اسے دیکھتا رہتا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے کلو کی آنکھیں اس کا مذاق اڑا رہی ہیں۔ جیسے وہ اس سے کہہ رہی ہوں کہ تم مجھ سے جتنی چاہے نفرت کر لو تمھارے دل پر میرا ہی راج ہے۔ ایسے موقع پر سجو چڑ جاتا لیکن کسی نادیدہ جذبے کے تحت اس سے مغلوب بھی رہتا۔ کلو اس سے جو بات چاہتی منوا لیتی اور وہ مان بھی جاتا۔ نہ صرف سجو بلکہ باقی گھر والے بھی اس کی مانتے تھے۔ "سارے گھر میں کلو کی شہنشاہیت ہو گئی۔ اس ڈکٹیٹر کے سامنے پھر کسی کی زبان نہیں کھلی۔" ۱۳ جب کلو کی شادی ہو گئی تو سجو کی پریشان حالت دیکھ کر اس کی بہن رضیہ بھی اسے اس بات کا طعنہ دیتی ہے۔ وہ کہتی ہے:

" بھئی کلو باجی ہوتیں تو ہم بھی دیکھتے چاہے آپ انھیں مار ڈالتے تو بھی آپ کو شیو کرنا پڑتی۔" ۱۴

بھابھا کا یہ نقطۂ نظر کہ نوآبادیاتی باشندے آزادی کے بعد بھی متضاد جذبات کا شکار رہتے ہیں اور یہ کہ وہ کسی خاص فرد سے بیک وقت محبت اور نفرت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا بیانیوں سے واضح ہو جاتا ہے۔ اسی حوالے

سے انھوں نے ایک اہم بات یہ کہی کہ مقامی باشندے اپنی ثقافت اور نوآبادکار کی ثقافت لیے دوغلا پن اپنا لیتے ہیں اور جب دو یا دو سے زیادہ ثقافتیں ملتی ہیں تو مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اعلانیہ تیسری جگہ پر پیدا ہونے والے کلچر کا اظہار کرتا ہے جبکہ دقیانوسی تصورات کے حامل افراد اپنے تصور کے استحکام پر انحصار کرتے ہیں۔ اعلانیہ کا طریقہ کار ایک روایتی کلچر اور قائم ہونے والے کلچر کے درمیان تقسیم کو متعارف کرواتا ہے۔۱۵ زیرِ نظر افسانے میں مختلف جگہوں پر اعلانیہ کا اظہار ملتا ہے۔ مختلف جگہوں پر سجو کا رویہ اس کی توضیح کرتا ہے۔ ایک بار کلوا سے کہتی ہے کہ تمھیں تو آمنہ کے روپ میں اپنی خوابوں کی ملکہ مل گئی ہے۔ اب دیکھو مجھے کب سپنوں کا راجہ ملے گا تو سجوا سے کہتا ہے:

"ہشت! لڑکیاں ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ کیوں؟

کیونکہ یہ بے حیائی ہے۔"۱۶

یوں تو سجو گوروں کی ظاہری اقدار کو پسند کرتا ہے لیکن اندر سے وہ ان کے آزاد رویوں کو قبول نہیں کرتا اسی لیے وہ کلو کو ایسی باتیں کرنے سے منع کر دیتا ہے جو ہماری اقدار میں اچھی نہیں سمجھی جاتیں۔

افسانے کا پہلا فقرہ روایتی بیانیے کا بھرپور اظہار ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ:

"جب کسی بدصورت عورت کا روپ ڈس لیتا ہے تو انسان جنم جنم کا روگی بن جاتا ہے۔"۱۷

اس فقرے میں جو چیلنج ہے وہ دقیانوسی تصورات کے حامل افراد کے تصورات کی تشریح کرتا ہے اور بھابھا کے اس نکتے کی توضیح کرتا ہے کہ ایسے افراد اپنے تصور کے استحکام پر انحصار کرتے ہیں۔ کلو اس گھر سے تو چلی گئی لیکن سجو کے دل سے نہ گئی۔ سجو اس کی رنگت سے تو نفرت کرتا تھا لیکن ذہنی طور پر اسی کے تصورات میں گھرا رہتا۔ گورے رنگ کی محبت میں گرفتار ہونے کے باوجود کالے رنگ کے عشق کے ناگ سے ڈسا جاتا ہے اور جنم جنم کا روگی بن جاتا ہے۔ سجو اپنی کیفیت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"مجھے رضیہ بھی اچھی نہیں لگتی جس کی سفید جلد اور پیاز کے پرت ایک سے ہیں اور تو اور مجھے آمنہ سے بھی چڑ ہو گئی ہے وہی آمنہ جس کی نیلی آنکھیں دیکھ کر بے ہوش سا ہو جایا کرتا تھا۔"۱۸

سجو نوآبادکار کی ثقافت لیے متضاد کیفیات کا شکار ہے اور اسی وجہ سے وہ نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ بھابھا کے مطابق مابعد نوآبادیات اثرات میں ایک رویہ نقالی کا بھی پنپتا ہے۔ یعنی باشندے نوآبادکاروں کی ثقافت ان سے مماثلت کی خاطر اپنا لیتے ہیں مگر مکمل طور پر ان کی ثقافت نہیں اپنا سکتے۔ یہاں سجو بھی مغربی رویہ اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔۱۹ لیکن اسے مکمل طور پر اپنانے سے قاصر ہے۔ مغربی نقالی میں وہ چائے میں چینی نہیں پیتا لیکن کلو کے اصرار اور

دل کے مجبور کرنے پر اسے ایک پیالی میں تین تین چمچ چینی پینی پڑ جاتی ہے۔ وہ برش سے دانت صاف کرتا تھا لیکن کلو نے کوئلے کا منجن بنا کر دیا تو وہی استعمال کرنے لگا۔ یہاں تک کلو نے اس کا کرکٹ کا شوق تک ختم کروا دیا۔ سجو مغربی نقالی میں کالے رنگ سے نفرت تو کرتا تھا لیکن کلو سے نفرت کرنے میں ناکام تھا۔ وہ اپنے آپ کو بار بار اس وہم میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا کہ اسے آمنہ سے محبت ہوگئی ہے کیونکہ وہ گورے خدوخال کی مالکہ تھی۔ اسی لیے کلو اس سے پوچھتی ہے:

"سجو تجھے واقعی آمنہ سے محبت ہے؟

ہاں!۔۔۔۔ میں نے بڑے وثوق سے کہا تو پھر تو اسی سے بھاگتا کیوں ہے؟ اس نے پوچھا۔" ۲۰

اس فریب پن میں وہ اپنے آپ سے بھی یہ بات چھپاتا کہ وہ کلو کی محبت کے سامنے ہار گیا ہے۔ جب کبھی دل کی آواز بلند ہو جاتی تو وہ کلو سے کترانے لگتا۔ اسے ایسے محسوس ہوتا کہ اگر کلو سے آمنا سامنا ہوگا تو وہ اس کے دل کے چور کو پہچان جائے گی اور اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ لے گی، اسی لیے گھر سے اسے وحشت ہونے لگی۔ کلو جب رضیہ اور چھنا منا کے سنہری بال سلیقے سے بناتی تو سجو کو بہت حیرانی ہوتی۔ سجو اس کے بارے میں کہتا ہے کہ:

"ان سنہری تاروں میں زرد رنگ کے ربن اس سلیقے سے باندھتی کہ یہ سرخ و سپید بچیاں واقعی بدیشی مال لگنے لگتیں۔" ۲۱

اس کا خیال تھا کہ کیونکہ کلو کا رنگ کالا ہے لہٰذا اس کے طور طریقے بھی دقیانوسی ہوں گے۔ طریقہ سلیقہ اس کی پہنچ سے دور ہوگا لیکن جب اس کا سگھڑاپا دیکھتا ہے تو مخمصے کا شکار ہو جاتا ہے۔ ذہنی تعصب اسے کلو کی خوبیوں کا معترف نہیں ہونے دیتا۔ اس کے ذہن کے نہاں خانے میں یہ سوچ پہلے سے موجود ہے کہ کالے لوگ پھوہڑ اور بدسلیقہ ہوتے ہیں۔ سلیقہ طریقہ صرف گورے لوگوں کی میراث ہے اسی لیے کلو کی خوبیوں پر اسے یقین نہیں آتا۔ اس کی آنکھوں پر متضاد معاشرتی رویوں کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

بھابھا اپنی تھیوری میں ایک نکتہ یہ پیش کرتے ہیں کہ جب دو یا دو سے زیادہ ثقافتیں ملتی ہیں تو ایسی جگہ بنتی ہے جو اعلانیے کو تخلیق کرتی ہے اور ثقافتی بیانیے اور نظام ایسی تردیدی اور متضاد بیانیے کی جگہ پر تعمیر ہوتے ہیں۔ یہاں بیانیے ترجمے بھی ہو سکتے ہیں اور نئی طرز بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ یہاں ہر شخص کی انفرادیت دوہرے پن کے تناظر میں بیان ہوتی ہے اور اس جگہ کو ہم مقام ادغام (Place Third) کہیں گے۔ ۲۲

زیرِ بحث افسانے میں مختلف مقامات پر ادغام ملتا ہے جہاں ثقافتی بیانیے بھی منظرِ عام پر آتے ہیں۔ ایک موقع پر جب کلو دستانے بن رہی تھی تو سجو اس سے پوچھتا ہے کہ یہ آمنہ کے لیے کیوں بُن رہی ہو؟ وہ کہتا ہے:

"وہ تو تمھیں کچھ نہیں دیتی۔ آخر تم اسے کیوں اس قدر آسمان پر چڑھاتی ہو؟

اس لیے کہ جب وہ آسمان پر چڑھ جائے گی تو میں نیچے سے سیڑھی کھینچ لوں گی۔ کیا؟

آسمان پر چڑھانا ہی اس لیے ہوتا ہے کہ انسان دوسروں کے کام کا نہ رہے۔" ۲۳

مندرجہ بالا بیانیہ اعلانیے کو تخلیق کرتا ہے اور ایک نئی طرز اختیار کر لیتا ہے۔ سجو اپنے بچپن کا واقعہ بتاتا ہے کہ وہ سب اکٹھے کھیل رہے تھے تو رضیہ نے کہا:

"دیکھو ساجد بھائی! ہم سب انگریز ہیں اور یہ کالا آدمی۔۔۔۔

کون کالا آدمی۔۔۔۔ اور کون؟ کلو نے خونی آنکھیں نکال کر پوچھا تھا۔

تم کالا آدمی۔۔۔ اور کون؟ سلیم اپنی بہن کی تائید میں بولا۔

تم۔۔۔تم۔۔۔تم۔۔۔تم۔۔۔تم کالا آدمی! کلو منہ پھاڑ کر چیخی۔" ۲۴

یہاں کلو کی انفرادیت دوہرے پن کے تناظر میں بیان ہوتی ہے۔ ساجد اور اس کے بہن بھائی دوہرے پن کا شکار ہیں جس کی وجہ سے وہ خود کو برتر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا رنگ انگریزوں کی طرح سفید ہے لیکن یہاں کلو بھی کالے رنگ کے باوجود کالا کہلوانا پسند نہیں کرتی کیونکہ بچپن میں ذہنی طور پر وہ بھی تضاد کا شکار تھی۔

سجو کا یہ اعتراف کہ " کلو اگر سانولی نہ ہوتی تو واقعی پیاری چیز تھی۔" ۲۵ ایسے تردیدی نظام کی وضاحت کرتا ہے جہاں محبت بھی معاشرتی معیار پر پورا اترنے کے بعد کی جاتی ہے۔ محبت جیسے مخلص جذبے کو بھی انا اور احساس کمتری کے دھندلے شیشوں والی عینک سے پرکھنے کی ضد کی جاتی اور انجام مایوسیوں کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔ کلو سجو سے پوچھتی ہے کہ:

"تمھیں ویسی رنگت اچھی لگتی ہے جیسی۔۔۔۔ جیسی۔۔۔۔ جیسا کہ سودیشی مال ہوتا ہے۔۔۔ انگریزوں کا سا۔۔۔۔ بڑی غلامانہ ذہنیت ہے تمھاری۔۔۔" ۲۶

غلامانہ ذہنیت کا اعلانیہ یہاں واضح الفاظ میں سامنے آتا ہے۔ کلو کے احساس دلانے کے باجود سجو اپنے دوہرے معیار میں ہی طمانیت تلاش کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ کلو کا یہ بیانیہ کہ بدصورت عورت کے روپ کا ڈسا شخص جنم جنم کا روگی بن جاتا ہے، ثابت ہونے کے باوجود بار بار تردیدی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ افسانے کے آخر میں کلو خودی مایوسی کے عالم میں اس کی تردید کرتے ہوئے کہتی ہے کہ:

"لیکن ایسے نہیں ہوتا سجو۔۔۔۔ بدصورت عورت کے پاس روپ کہاں ہوتا ہے کہ وہ کسی کو ڈس سکے۔" ۲۷

اور سجو بھی خود فریبی کے عالم میں اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے سوچتا ہے کہ:

"لیکن میں روگی نہیں ہوں اور جنم جنم کا روگی رہ بھی نہیں سکتا۔ بس یاد کا ایک اندھیرا ہے کہ سارے گھر پر مسلط ہے۔"۲۸

لیکن حقیقت یہی ہے کہ کلو کو نہ پا کر وہ خالی پن محسوس کرتا ہے۔ اس کے سپنوں کی سانولی رانی اس کے دل کے ایوان کو ویران کر کے چلی گئی تھی اور وہ خود اپنی خود فریبی، خود ترسی اور معاشرتی رویوں کے گورکھ دھندے سے نکلنے میں ناکام رہا تھا۔

بھابھا کی مابعد نوآبادیات اثرات کی تھیوری کے تناظر میں افسانے ''کلو'' کے تجزیے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس افسانے کے کردار مابعد نوآبادیات رویوں کی عکاسی کرتے ہیں جس سے مابعد نوآبادیاتی باشندوں کا دوغلا پن، متضاد جذبات، ثقافتوں کا فرق، اعلانیہ اور دقیانوسی تصورات، نقالی اور مقام ادغام کی سطح پر ہونے والے رویوں کے تجزیات شامل ہیں اور مصنفہ نے بہت اچھے طریقے سے ان رویوں کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ نے مابعد نوآبادیاتی اثرات میں مقامی باشندوں کی نفسیاتی کش مکش کو بیان کیا ہے۔ ایسے باشندے جو غلامی میں سو سال گزارنے کے بعد بھی غلامانہ ذہنیت سے نجات نہ پا سکے۔ ظاہری طور پر وہ سامراجی قوتوں کے رویے اپنائے ہوئے ہیں لیکن اندرونی طور پر کھوکھلے پن کا شکار ہیں اور معاملات زندگی میں تذبذب اور گھٹن محسوس کرتے ہیں اور اسی وجہ سے خود اذیتی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہمارے دوہرے سماجی رویے ان حقائق کو دھندلا دیتے ہیں جس سے معاشرے میں ذہنی انتشار فروغ پاتا ہے جو رنگ اور نسل کو بنیاد بنا کر انسان کو انسانیت کی معراج سے دور کر دیتا ہے۔ ہومی بھابھا کی یہ تھیوری بلاشبہ ان مخصوص اثرات کی نشان دہی کرتی ہے جو کہ مابعد نوآبادیات معاشرے میں پختہ رویوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ انھی استحصالی رویوں کے خلاف بانو قدسیہ نے اپنی اس تحریر میں آواز بلند کی ہے جو شاید اہلِ فہم تک پہنچے اور بہتری کی راہ ہموار کر سکے۔

حوالہ جات

۱۔ بانو قدسیہ، کچھ اور نہیں، مکتبہ اُردو، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۴۲۔

2. Routledge: New York, *The location of culture* , Bhabha, K.Homi, ISBN 0-415-33639-2,1994

۳۔ ایضاً،ص ۵۷۔

۴۔ بانو قدسیہ، کچھ اور نہیں، مکتبہ اُردو، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۴۲۔

۵۔ ایضاً،ص ۴۸۔

۶۔ ایضاً،ص ۴۶۔

۷۔ ایضاً،ص ۵۸۔

8. Routledge: New York, *The location of culture* , Bhabha, K.Homi, ISBN 0-415-33639-2 P.132,1994

۹۔ بانو قدسیہ، کچھ اور نہیں، مکتبہ اُردو، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۵۰۔

۱۰۔ ایضاً،ص ۴۴۔

۱۱۔ ایضاً،ص ۲۵۔

۱۲۔ ایضاً،ص ۳۵۔

۱۳۔ ایضاً،ص ۴۶۔

۱۴۔ ایضاً،ص ۴۵۔

15. Routledge: New York, *The location of culture* , Bhabha, K.Homi, ISBN 0-415-33639-2 P.145,1994

۱۶۔ بانو قدسیہ، کچھ اور نہیں، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۷۶ء ص ۵۹۔

۱۷۔ ایضاً،ص ۳۹۔

۱۸۔ ایضاً،ص ۴۱۔

19. Routledge: New York, *The location of culture* , Bhabha, K.Homi, ISBN 0-415-33639-2 P.132,1994

۲۰۔ بانو قدسیہ، کچھ اور نہیں، مکتبہ اُردو، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۶۸۔

۲۱۔ ایضاً،ص ۵۳۔

22. Routledge: New York, The location of culture , Bhabha, K.Homi, ISBN 0-415-33639-2 P.175,1994

۲۳۔ بانو قدسیہ، کچھ اور نہیں، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۵۷۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۴۲۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۴۷۔

۲۶۔ ایضاً

۲۷۔ ایضاً، ص ۷۱۔

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۱۔